© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور سیاسی ہیئتِ حاکمہ

علامہ اقبالؒ نے فکرِ جدید اور اس کے ہمہ گیر استیلاء کے لیے کئی پیرائے استعمال کیے ہیں‘ جن سے اہلِ علم بخوبی واقف ہیں۔ مثلاً بعض اشعار میں انہوں نے عہدِ نو کو ’’برق‘‘، ’’نئی آگ‘‘، ’’مئے مغرب‘‘ جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک شعر میں جدید تہذیب وتمدن کی علمی منہاج کو ’’ظاہر پرست‘‘ اور دانش مغرب کو ’’عذاب‘‘ قرار دیا ہے۔ مغربی فکر و تہذیب پر ان کا عمومی نقد وتبصرہ ’’دل کی خرابی‘‘ اور ’’خرد کی معموری‘‘ کے الفاظ میں بہت بھرپور اور پُرمغز انداز میں قارئین کے سامنے آتا ہے۔ عہدِ نو کی فکری حشر سامانیاں تمام روایتی اور غیر سائنسی افکار و اقدار کو بھسم کرنے کے درپے ہیں اور اس کی لپیٹ میں بالخصوص اسلامی تہذیب وتمدن کے اصول اور حیاتِ انسانی کے لیے دیے گئے قواعد وضوابط آتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی مادہ پرستانہ سوچ کو علامہ اقبال نے فارسی کے اس سادہ شعر میں خوب سمویا ہے۔

عصرِ ما وارفتہ آب و گِل است
اہلِ حق را مشکل اندر مشکل است

آج بھی مغربی فکریات کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو علامہ اقبال کی کم وبیش ایک صدی قبل کی گئی نقد‘ یورپ اور امریکہ کی دانش گاہوں سے آنے والی کتب اور فلسفیانہ افکار پر سو فیصد پوری اترتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب نسبتاً زیادہ پُرشکوہ لفاظی اور نئی نئی اصطلاحات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مذہب اور مذہبی معتقدات کا واضح اور صاف الفاظ میں انکار تو نہیں ملتا‘ لیکن ان کی ایسی تعبیرات اور تشریحات کی جاتی ہیں جن سے دین و مذہب کی اصل روح اور تاریخیت دم توڑتی نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام دوسرے مذاہبِ عالَم بڑی حد تک سیکولرائزیشن کے آگے surrender کر چکے ہیں‘ لیکن مغربی دانشور حیرانی اور سراسیمگی کے عالم میں شکوہ کناں ہیں کہ آخرت (روحانی) اور دنیوی پہلوؤں کے درمیان ایک گہرا نامیاتی رشتہ رکھنے والا دین —— اسلام —— سیکولرائزیشن اور لبرل ازم کے آگے قطعاً جھکنے کے لیے تیار نہیں ہے‘ اور اس طرح کی تمام کاوشوں کو resist کرتا ہے۔ انہیں یہ شکایت ہے کہ مسلمان کیوں ایک عالمی سیاسی اور معاشی نظام (world order) کا حصہ بننے کے لیے تیار نہیں!

فی الحقیقت اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بالکل آغاز سے اپنی تعریف اور شناخت میں قطعیت کے ساتھ کلام اللہ یعنی قرآن کی نازل شدہ آیات میں واضح کر دیا گیا تھا۔ دوسرے مذاہب بالخصوص عیسائیت کے برخلاف اس کے بنیادی عقائد اور تہذیبی افتاد و منہج کی تشکیل دو اڑھائی صدیوں کے بعد نہیں ہوئی۔ چنانچہ روزِ اوّل سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشرکینِ مکّہ جان گئے تھے کہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کی دعوت اور کلمۂ شہادت ان کے باطل نظامِ سیادت و سماج پر تیشہ چلانے والا ہے اور ایک خدائے واحد کی حکمرانی کے قیام اور اس کے احکام کی تنفیذ کا نقیب ہے۔ کلمۂ شہادت پہلے معبودانِ باطل کی کامل نفی اور پھر خدائے واحد کا اثبات کرتا ہے۔ مشرکینِ مکہ کا پورا نظام ان جھوٹے خداؤں کے بتوں کی وجہ سے تھا جن کے لیے جملہ قبائل کی عقیدت اور نذر و نیاز اور چڑھاووں کے ذریعے مکہ کے مراعات یافتہ لوگ امن وسکون اور پُرتعیش زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے تجارتی قافلوں سے بھی کوئی تعرض نہ کرتا تھا۔ چنانچہ دینِ متین کے سیاسی مضمرات کوئی زائد یا ثانوی مظاہر نہیں بلکہ قرآن کی شکل میں نازل شدہ الٰہیاتی فکری بنیادوں سے فطری وطبعی طور پر پھوٹتے ہیں' اور اس میں کسی تبدیلی کا ہرگز کوئی امکان نہیں ہے۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ نے ۲۳ سالہ جِدّوجُہد کے نتیجے میں بنفسِ نفیس اسلام کو پوری جامعیت اور روحانی وسیکولر (دنیاوی) پہلوؤں کی توحید کے ساتھ عملاً قائم کیا۔ بالفاظِ دیگر اسلام تاریخِ عالم میں مابعد الطبیعیاتی دینی عقائد یعنی ایمانیات اور سیاسی غلبہ وقوت کی وحدت کے طور پر سامنے آیا ہے۔

مغربی دانشور اور مصنفین اسلام میں دین و دنیا کی اس نامیاتی وحدت کے برخلاف اسلام کے دو چہروں کی بات کرتے ہیں۔ ایک چہرہ انفرادی' قلبی' ذوقی' تعلق مع اللہ یا دوسرے الفاظ میں احسان یا تصوف والا چہرہ ہے جو ان کے لیے قابلِ قبول ہے۔ دوسرا چہرہ ان کے بقول سیاسی آئیڈیالوجی کی شکل میں ہے جس کا تعلق اجتماعی و سیاسی نظمِ ہیئت یعنی خلافت اور نظامِ عدل وقسط سے ہے۔ مستشرقین اسلام کے مؤخر الذکر چہرے یا پہلو کو ایک خون آشام پبلک آئیڈیالوجی کے طور پر دیکھتے ہیں جسے وہ اول الذکر (ذاتی وایمانی کیفیت کا اسلام) سے بالکل مختلف بلکہ اس کا نقیض گردانتے ہیں۔ میں یہاں اس کی چند مثالیں پیش کروں گا۔

(۱) پروفیسر منٹگمری واٹ کی سیرتِ رسول ﷺ پر دو الگ الگ جلدیں "Muhammad at Makkah" اور "Muhmamad at Madina" اس بات کا اعلان ہیں کہ مکہ میں محمد ﷺ کی حیثیت واقعی ایک نبی اور اخلاقی وسوشل ریفارمر کی ہے جبکہ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد وہ فوراً جنگجو سپہ سالار اور حکومت واقتدار کے حصول میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس طرح منٹگمری واٹ کی نظر سے آنحضور ﷺ کے انقلاب اور دینِ اسلام کی سربلندی کی کاوشوں کے تدریجی مراحل اوجھل رہتے ہیں۔

(۲) امریکی نقاد پال برمین پولیٹکل اسلام کے علمبرداروں کے لیے ہر قسم کے گھٹیا اور نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہوئے انہیں بیسویں صدی کے بیمار ذہن یورپی فاشسٹ لوگوں کی طرح ایک گروہ قرار دیتا ہے اور اپنے اس خیال کا برملا اظہار کرتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کو ان حضرات سے آخری خاتمے تک جنگ جاری رکھنی ہے۔ (بحوالہ تصنیف Terror & Liberalism' شائع شدہ ۲۰۰۳ء)

(۳) اسلام اور قرآن کا سات دہائیوں پر مشتمل طویل اور انتہائی گہرا مطالعہ کرنے والا کینتھ کریگ بھی اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہا ہے کہ اسلام آغازِ وحی سے اپنی theopolitical تعلیمات کی شکل میں انسانوں کے کردار اور افعال کو پوری جامعیت (نفسیاتی' قانونی' کلچرل' سیاسی) کے ساتھ متاثر کرنے اور نظامِ شریعت کے تحت تنظیم کا دعوے دار ہے۔ اس کے برعکس یہودی اور عیسائی مذہبی روایات بالعموم غیر سیاسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(apolitical) ہیں‘ جنہوں نے خدا کے اختیارِ مطلق اور توحید کے ضمن میں بھی کجی اختیار کی ہے۔

میں یہاں کریگ کی بیسویں صدی کی آخری دہائی میں شائع ہونے والی دو کتابوں کا خاص طور پر حوالہ دوں گا‘ جو یہ ہیں:

(i) Muhammad and the Christian: A Question of Response

(ii) Jesus and the Muslim : An Exploration

ان دو کتابوں کے حوالے سے کریگ کی جو تنقید اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ پر کی گئی ہے‘ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب کے ایک بانی اور اخلاقی ریفارمر نے اپنے ہاتھ (نعوذ باللہ) سیاسی معاملات اور غلاظت میں پڑ کر میلے اور آلودہ کر لیے۔ کریگ طویل عرصے عرق ریزی کے ساتھ قرآن اور اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکا کہ اللہ اکبر کے کلمے اور نعرے کا مطلب ہی اپنی خواہشات‘ آراء اور ہر قسم کی عصبیتوں کی نفی کر کے اللہ کی کبریائی اور حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ اس طرح رسول اکرم ﷺ کا اقدام اور مسلّح جدّوجُہد کو ترک کر دینا حاکمیتِ خداوندی کے قیام سے دست کش ہونے کے مترادف ہوتا۔ اگر رسولِ ناصریؑ نے سیاسی غلبہ واقتدار کا آپشن بوجوہ استعمال نہیں کیا یا اس کا امکان اور مواقع پیدا نہیں ہوئے تو یہ ضروری نہیں کہ بعد میں آنے والے رسول بھی اسی اسٹریٹیجی پر عمل کریں۔ جبکہ خاتم الانبیاء کی حیثیت سے دینِ متین کا عملاً قیام اور حاکمیت خداوندی کے تحت اسلامی خلافت کے نظامِ عدل وقسط کا قیام آپ ﷺ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی دین جس کی بنیادیں انتہائی اخلاقی اور روحانی ہوں‘ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی فتح صرف روحانی واخلاقی نوعیت کی ہو اور سیاسی اعتبار سے وہ قطعاً خالی ہو۔ یہی بنیادی فرق ہے جو اسلامی انقلاب کو تاریخ کے تمام دوسرے انقلابات مثلاً روس کے بالشویک انقلاب‘ انقلابِ فرانس وغیرہ سے ممیّز کرتا ہے۔ عیسائیت اور بدھ مت کونسٹنٹائن اور اشوکا جیسے شہنشاہوں کی سرپرستی کی وجہ سے تبلیغی اور عالمگیر مذاہب بنے‘ جبکہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے خود بنفسِ نفیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر عرب میں اسلام کو نافذ وغالب کیا اور اسلامی حکومت کی توسیع کا عمل اپنی حیاتِ طیبہ میں شروع کر دیا۔

کوئی بھی حق کا علم اٹھانے والا دین (سوائے رہبانیت یا تیاگ کا فلسفہ ماننے والوں کے) سیاسی لازماً ہو جاتا ہے۔ اس کی چار سطحیں ہیں‘ پہلی دو میں کوئی بھی مذہب ہلکے انداز میں سیاسی جبکہ آخری دو سطحوں پر وہ گاڑھے انداز میں سیاسی ہو جاتا ہے‘ اور یہی اسلام کے ساتھ مختص ہیں‘ اگرچہ پہلی دو سطحوں سے بھی اسلام کا تعلق ہے۔

(۱) اسے وقت کے سیاسی نظام اور اہلِ اقتدار سے کچھ نہ کچھ معاملہ کرنا پڑتا ہے

(۲) مذہبی افراد کی کثیر تعداد اخلاقی بنیادوں پر غیر عادلانہ اور غیر منصفانہ ومعاشی نظام کو چیلنج کرتی ہے۔ پُرامن احتجاج اس کے لیے مناسب اور جائز راستہ ہو سکتا ہے۔ اسلام اس سلسلے میں بقدرِ ضرورت عسکریت (militancy) اور انقلابی طریقے کی اجازت بھی دیتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی فقہی رائے کے مطابق ظالم حکمران کے خلاف ”خروج“ (کامیابی کی توقع کی شرط کے ساتھ) کی بھی اجازت ہے۔ اس Activism میں کرسچئن لبریشن تھیالوجی کی طرح ہم اسلام کی لبریشن تھیالوجی کو نمایاں کر سکتے ہیں جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں لوگوں کو جابر اور سفاک حکمرانوں کے ظلم سے آزاد کرایا جاتا ہے۔ ظالم حکومت کے خلاف خروج کو حرابہ کے مشابہ قرار دینا سخت ناانصافی ہے۔

(۳) اسلام کی رو سے سیاست دین کا جزو ہے اور دین کی تعلیمات اُس کا بھی احاطہ کرتی ہیں۔ فقہاء نے اسلامی حکومت و سیاست کی کلاسیکل تھیالوجی اور اس کے اصول وضوابط وضع کیے ہیں۔ اجتماعی نظم سے آگے اس سیاسی تگ وتاز کا ہدف خلافت کے اصول پر استوار ریاست اور حکومت کا نظام قائم کرنا ہے۔ انفرادی نیکی اور اصلاح کو بھی قوانین کے ذریعے پبلک سطح پر بالجبر نافذ کیا جاتا ہے۔ شریعت کے قوانین کے ذریعے ریاست اپنا اثر ونفوذ انفرادی زندگیوں تک پھلاتی ہے۔

(۴) اسلام کا آغاز بحیثیت امپیریل پاور مثالی ہے۔ کوئی اور مذہب شعوری طور پر ایمان اور سیاسی اقتدار کے اشتراک کی شکل میں شروع نہیں کیا گیا۔ اگرچہ اہلِ اسلام نے لوگوں کو تلوار کے زور پر حلقہ بگوشِ اسلام نہیں کیا' تاہم اخلاقی وعسکری فتوحات کے ذریعے نظام کو توحید اور اسلامی تعلیمات کے مطابق بنا کر عوام الناس کے لیے اسلام کی حقانیت کو پہچاننا آسان بنا دیا۔ یعنی اس کے مواقع فراہم کیے گئے۔ اسلامی فتوحات اور اس کی آفاقی مذہبی اپیل باہم مربوط ہیں۔ اور صوفیاء نے اس زمینی پھیلاؤ اور اثر ورسوخ میں پُرامن طریقے پر دعوت وتزکیہ کے ذریعے اہم رول ادا کیا۔ اسلامی حکومت کا مقصد دنیا میں اللہ کی حکمرانی یعنی اس کی شریعت کی حکمرانی کا نظام قائم کر کے پورے نظامِ حیات پر اظہارِ دینِ حق یعنی نظامِ عدل وقسط کا قیام ہے۔

بلاشبہ ہماری تاریخ میں سیاسی اقتدار کے تحت کیے گئے مظالم اور ناانصافی کے واقعات ملتے ہیں' تاہم کینتھ کریگ نے اپنی تنقید میں اقتدار اور سیاسی غلبے کے حوالے سے بہت ہی غیر علمی اور عامیانہ رویے کا اظہار کیا ہے۔ جبکہ قرآن نے کئی جگہوں پر 'نصر' یعنی اللہ کی طرف سے دی گئی فتح اور بالادستی کو sanctify کرنے کا حکم دیا ہے۔ سورۃ النصر کا مضمون اسی حکم کو اجاگر کرتا ہے جس میں اللہ کی نصرت اور فتح اور لوگوں کے جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہونے پر فتح کے شادیانوں کی بجائے اللہ کے حمد وشکر کی تسبیح اور استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ تاریخ کے دوسرے شہنشاہوں اور اہل اقتدار کی ہوسِ ملک گیری کے مقابلے میں اسلام میں حکومت واقتدار' اللہ کی خوشنودی' اس کی حاکمیت کے قیام اور بندوں کے لیے اطاعت کے نظام (نظامِ بندگی) کو ممکن اور سہل بنانا ہے۔ چنانچہ مسلمان حکمرانوں اور ملکی وملی امور کے ذمہ داران کو قرآن حکیم اور احادیثِ رسولؐ میں متعدد ہدایات دی گئی ہیں۔ دین اور دنیا کی وحدت کی تحسین کی بجائے کریگ کو آنحضورﷺ کی ہجرت کے بعد مدینہ میں گزاری ہوئی دہائی میں (معاذ اللہ) رومی جرنیل سیزر کا کردار نظر آتا ہے' جس نے وحی کی وہ روحانیت جو مکہ میں نظر آتی تھی کا ابطال کر دیا۔ وہ بالکل غلط طور پر روحانیت اور سیاسی غلبہ واقتدار کی ثنویت اور مغائرت کا قائل ہے اور سمجھتا ہے کہ باطل کے خلاف مسلح تصادم سے پیغمبرانہ مشن کی اخلاقی وروحانی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ آنحضورﷺ محض اخلاقی واعظ اور سوشل ریفارمر ہی نہیں تھے بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دین حق اور میزان (نظام عدل وقسط) کو تمام دوسرے نظام ہائے زندگی پر غالب کرنے کا منصب سونپا تھا۔ اور آپؐ نے بالفعل ہر قسم کے تشدد اور مخالفت کو انگیز کرتے ہوئے اور اپنے عزیز ترین اعزہ اور ساتھیوں کی جان ومال کی قربانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بعد اس منزل کو پایا۔

بعض تجزیہ نگاروں اور اہلِ دانش کا خیال ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور مسلمان ممالک کی آزادی کے بعد اسلام اور سیاسی اقتدار و ریاست کی یکجائی پر مشتمل نظریہ پہلی بار سامنے آیا۔ جبکہ تاریخ کی ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اہلِ علم کی اکثریت اور قرآن و سنت کی تعلیمات سے گہرا شغف اور تبحر علمی سے متصف ملّتِ اسلامیہ کے سرکردہ مشاہیر نے ہمیشہ یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اسلام اور ریاست باہم لازم وملزوم ہیں' اور ان دونوں میں علیحدگی ملّتِ اسلامیہ کے زوال اور پچھلی دو اڑھائی صدیوں کے دوران مسلمان ممالک کے یورپی نوآبادیاتی نظام میں جکڑے جانے کا نتیجہ ہے۔ نوآبادیاتی تسلط کے تحت مرعوبیت اور یورپی تہذیب وتمدن سے متاثر ہو کر چند وہ دانشور جنہوں نے مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کی تھی' اس موقف کے پیش کنندہ بنے کہ اسلام کا کوئی تعلق ریاست اور سیاسی اقتدار سے نہیں ہے۔ اس طرح ان حضرات کا تصورِ دین اسلام کو صرف مذہب کی سطح تک محدود کر دیتا ہے اور اجتماعیت کے جملہ پہلو ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ایسے دانشور اپنے فکر کو عجیب وغریب استدلال سے مزیّن کرتے ہیں اور زخرف القول کے ذریعے عوام الناس کو دھوکا دیتے ہیں۔ مثلاً ان کے خیال میں قرآن کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس کے مخاطب بادشاہ یا حکمران ہوں۔ قرآن کے مخاطب تو حضرت محمد ﷺ اور بالعموم عام لوگ اور بالخصوص اہلِ ایمان ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ حضرات آیتِ قرآنیہ ''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ'' کی کیا تعبیر کریں گے جس میں حکومت و پادشاہی کا حق دار صرف صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے! اسی طرح مسلمانوں کے ''تمکن فی الارض' یعنی زمین میں غلبے اور اقتدار کے بعد ان کا کیا رویہ ہونا چاہیے' کی صراحت ہے۔ مزید برآں ''اولوالامر'' کی اصطلاح تو متعدد جگہوں پر آئی ہے' جس کا واضح اشارہ ملّت اسلامیہ کے اجتماعی وسیاسی امور کے ذمہ دار سربراہان کی طرف ہے۔ ماضی کے بہت سے مسلمان مفکّرین نے سیاسی اسلام کے موضوع پر بڑی معرکۃ الآرا تصانیف شائع کی ہیں' مثلاً الماوردی کی **الأحكام السلطانيه** اور دوسری متعدد نگارشات۔ لہٰذا یہ کہنا کہ سیاسی اسلام جدید دور کی پیداوار ہے' کسی طور پر بھی صحیح نہیں ہے۔

دِقّتِ نظر اور زیادہ گہرائی سے تنقیدی تجزیہ کیا جائے تو فکرِ جدید کے گرویدہ ان فضلاء میں برصغیر پاک وہند میں دوسروں کے علاوہ سرِفہرست مولانا وحید الدین خان اور جناب جاوید احمد غامدی ہیں۔ ان کے تصورِ دین کو گورنمنٹ اور اسٹیٹ کی ناگزیریت کے بغیر ''اخلاقی مذہب'' (Islam as private ethical faith) قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ حضرات اپنی نگارشات میں اسلام کو صرف ایک پُرامن ایمانی و اخلاقی دعوت تک محدود رکھتے ہیں اور ہیئتِ اجتماعیہ کی سطح پر اسلام کی حیثیت بطور سیاسی نظمِ حکومت اور اسٹیٹ قائل نہیں ہیں۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ان سکالرز کے برخلاف علامہ اقبال جیسے نابغہ جن کا فکر و تہذیبِ مغرب کا مشاہدہ اور اس پر عملی گرفت بہت عمیق اور وسیع تھی' نے اسلام اور حکومت و سیاسی قوت کے اجتماع اور حاکمیتِ خداوندی کے مضمرات کو نثر اور شعر دونوں میں نہایت وضاحت اور زور دار انداز میں بیان کیا ہے۔ ماضی قریب میں مرحوم ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے بھی اپنے علمی مضامین میں ایک با اصول منظّم اجتماعیت کے قیام کو ایمان و اسلام کے لازمی تقاضے کی حیثیت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیان کیا ہے۔ اگرچہ ان کی بعض فلسفیانہ اور فقہی آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے' لیکن مندرجہ ذیل الفاظ اجتماعیت اور ریاست کے حوالے سے ان کے خیالات اسلام کی قرنِ اوّل کی قرآن وسنت پر مبنی تفہیم کی ترجمانی کرتے ہیں:

"...... personal inner faith is by no means enough for God's purposes, and an organized normative community is a dire necessity." [(1)]

راقم نے اپنی ایک تحریر میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے اس فکر کو کینٹ ویل سمتھ کے اسی سیاق میں استعمال کردہ ایک نسبتاً تکنیکی وعملی لفظ 'reification' کی تائید وتصویب کے طور پر بیان کیا ہے۔ یعنی ایک جانب ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور دوسری طرف غیر مسلم محقق کینٹ ویل سمتھ اسلام کے اجتماعی نظم اور سیاسی رول کے بارے میں ایک ہی مثبت رائے رکھتے ہیں:

"He (Dr. Fazlur Rehman) thus fully affirms 'reification' (W.Cantwell Smith's expression) of Iman in a spatio-temporal context and impugnes all modernists' attempt to empty Islam of its political content." [(2)]

ہمارے ہاں حکومتی سرپرستی اور مغربی اثر ونفوذ کے زیر اثر پروان چڑھنے والا تصوف اور ہمہ اوستی افکار بھی اسلام کو صرف ایک روحانی واخلاقی تعلیم اور انسان دوست مذہب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی صورت حال ''روایت'' کے علمبرداروں کی ہے جو صرف فرد کی ذاتی اصلاح اور روحانی بالیدگی پر اپنا فکر مرکوز رکھتے ہیں اور اس طرح وہ مابعد جدیدیت کی مذہب کی وہ تعریف قبول کر لیتے ہیں جس میں مذہب کو فرد کے باطنی اطمینان اور آسودگی تک محدود کر کے کسی اجتماعی نظم اور ہیئتِ سیاسی سے قطعاً اعتناء نہیں کیا جاتا۔ اس طرح عالمی سیاسی وتہذیبی سطح پر یہ لوگ اسلام کو ایک بالکل غیر مؤثر اور انتہائی محدود تناظر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

قارئین کے علم میں ہے کہ زیر نظر جریدہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے جس کا چالیسواں سالانہ اجلاس دسمبر ۲۰۱۲ء کے آخری ہفتے میں منعقد ہوا ــــــ یعنی مرکزی انجمن کے مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمہ اللہ نے اس کا آغاز ۱۹۷۲ء میں کیا تھا اور یوں بحمد اللہ مرکزی انجمن اپنے مقاصد اور قرآن کریم کی ہدایت اور افکار کی اشاعت کا اہتمام حتی المقدور کر رہی ہے۔ صدر مؤسس کو ہم سے دار الخلد کی طرف مراجعت کیے امسال ۱۴/ اپریل کو تین سال ہو رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین!)

سطورِ بالا میں پیش کردہ خیالات کہ کس طرح اسلام اپنی جامعیت کے ساتھ نفاذ اور تہذیبی وسیاسی غلبے کا تقاضا کرتا ہے اور غلبہ ریاست کی سطح پر کیونکر منشائے دین ہے' مؤسسِ انجمن نے اپنے متعدد خطابات اور

---

(1) The Journal of Religions Ethics, University of Chicago Prss (USA) 1982.

(2) General Prologue, Knowledge- Morality News, Concept Media Books, Lahore 1995 p--26-7

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابوں میں شرح وبسط اور مدلل انداز میں پیش کیے ہیں۔ چنانچہ راقم کہہ سکتا ہے کہ یہ زیادہ تر انہی کے افکار کی ترجمانی ہے۔ اس ضمن میں ان کے کئی کتابچے مثلاً ''اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید وتعمیل اور اس سے انحراف کی راہیں''، ''فرائضِ دینی کا جامع تصور'' اور مبسوط کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کا مطالعہ بالخصوص مفید رہے گا۔ برادرِ مکرم رحمۃ اللہ علیہ نے فطری طور پر جہاں عملاً اپنے فکر اسلامی کو برِعظیم پاک وہند کے تناظر میں رکھ کر پیش کیا' وہیں اس کی اساسات بلاشبہ قرآن کریم کی واضح نصوص اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور امت کے صاحبِ بصیرت علماء اور مفکّرین سے ماخوذ راہنمائی پر رکھی ہیں۔ انہوں نے اسلام کے حرکی تصور کے سامراجی دور میں اضمحلال اور دوبارہ احیاء کی پوری تاریخ اور تمام ماخذ واضح کیے ہیں۔ اسی حرکی فکر اور اسلام کی ہمہ گیر اور ہمہ جہتی تشریحات کے لیے انجمن کی سطح پر سالانہ محاضرات کی محافل کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی اسلام بحیثیتِ دین اور اس کے سیاسی نظام کا موضوع زیر بحث آئے گا' تو ان کی شخصیت اور فکر کو سنگِ میل کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ اپنے خطباتِ جمعہ اور بیرونی اسفار کے دوران بھی انہوں نے فرائضِ دینی کا جامع تصور اور دینی سیاسی ہیئتِ حاکمہ کے قیام کی اہمیت کو بلاکم وکاست بیان کیا اور سامعین کو اس کے لیے انفاقِ مال اور بذلِ نفس پر اُبھارا۔ فللّٰہ الحمد!

مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کے شعبہ انگریزی کے جزوقتی معاون سید افتخار احمد صاحب کا دو ہفتے قبل ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوگیا۔ وہ اس روز حسب معمول اکیڈمی تشریف لائے تھے۔ شام کو گھر پر مغرب کی نماز کے لیے وضو کرنے کے بعد اٹھتے ہوئے گرے اور چند لمحوں میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں چونکہ طویل عرصے شعبہ انگریزی کے ناظم کے طور پر ان کے ساتھ آفس میں کام کرتا رہا ہوں' اس لیے ان کے مزاج' عادات اور انتہائی صالح طبیعت واطوار سے واقف ہوں۔ ہماری تحریک اور کام سے ان کا تعارف (جدہ) سعودی عرب میں پندرہ بیس سال قبل قیام کے دوران ہوا تھا' اور وہ وہاں باقاعدگی سے دروس اور اجتماعات میں شرکت کے ساتھ فعال رہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر کریں اور جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ آمین!

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

© rasailojaraid.com